تفہیم القرآن

ق

(۲)

اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم، اور اصحاب الرَّس[12]، اور ثمود، اور عاد، اور فرعون[13]، اور لُوط کے

---

[12] اس سے پہلے سُورۂ فرقان، آیت ۳۸ میں اصحاب الرّس کا ذکر گذر چکا ہے، اور دوسری مرتبہ اب یہاں ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ مگر دونوں جگہ انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کے سلسلے میں صرف ان کا نام ہی لیا گیا ہے، کوئی تفصیل ان کے قصے کی بیان نہیں کی گئی ہے۔ عرب کی روایات میں الرّس کے نام سے دو مقام معروف ہیں۔ ایک نجد میں، دوسرا شمالی حجاز میں۔ ان میں نجد کا الرّس زیادہ مشہور ہے اور اشعار جاہلیت میں زیادہ تر اُسی کا ذکر ملتا ہے۔ اب یہ تعیّن کرنا مشکل ہے کہ اصحاب الرّس ان دونوں میں سے کس جگہ کے رہنے والے تھے۔ اُن کے قصے کی بھی کوئی قابلِ اعتماد تفصیل کسی روایت میں نہیں ملتی۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنی بات صحت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ کوئی ایسی قوم تھی جس نے اپنے نبی کو کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ لیکن قرآن مجید میں جس طرح اُن کی طرف محض ایک اشارہ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں اہلِ عرب بالعموم اس قوم اور اس کے قصے سے واقف تھے اور بعد میں یہ روایات تاریخ میں محفوظ نہ رہ سکیں۔

[13] قومِ فرعون کے بجائے صرف فرعون کا نام لیا گیا ہے، کیونکہ وہ اپنی قوم پر اس طرح مسلط تھا کہ اس کے مقابلے میں قوم کی کوئی آزادانہ رائے اور عزیمت باقی نہیں رہی تھی۔ جس گمراہی کی طرف وہ جاتا تھا، قوم اس کے پیچھے گھسٹتی چلی جاتی تھی۔ اس بنا پر پوری قوم کی گمراہی کا ذمّہ دار تنہا اُس شخص کو قرار دیا گیا۔ جہاں قوم کے لیے رائے اور عمل کی آزادی موجود ہو وہاں اپنے اعمال کا بوجھ وہ خود

بھائی، اور ایکہ والے، اور تُبّع[۲۴] کی قوم کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں[۱۵]۔ ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا[۱۶] اور آخرکار میری وعید اُن پر چسپاں ہو گئی[۱۷]۔

اٹھاتی ہے۔ اور جہاں ایک آدمی کی آمریت نے قوم کو بے بس کر رکھا ہو، وہاں وہی ایک آدمی پوری قوم کے گناہوں کا بار اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فردِ واحد پر یہ بوجھ لد جانے کے بعد قوم سبکدوش ہو جاتی ہے۔ نہیں، قوم پر اس صورت میں اِس اخلاقی کمزوری کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اُس نے کیوں اپنے اوپر ایک آدمی کو اس طرح مسلط ہونے دیا۔ اِسی چیز کی طرف سُورۂ زخرف، آیت ۵۴ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۔ "اُس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ"۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ زُخرُف، حاشیہ ۵۰)۔

[۱۴] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۳۷۔ سُورۂ دخان، حاشیہ ۳۲

[۱۵] یعنی انہوں نے اپنے رسولوں کی رسالت کو بھی جھٹلایا اور ان کی دی ہوئی اِس خبر کو بھی جھٹلایا کہ تم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جاؤ گے۔

[۱۶] اگرچہ ہر قوم نے صرف اُس رسول کو جھٹلایا جو اُس کے پاس بھیجا گیا تھا، مگر چونکہ وہ اُس خبر کو جھٹلا رہی تھی جو تمام رسول بالاتفاق پیش کرتے رہے ہیں، اس لیے ایک رسول کو جھٹلانا درحقیقت تمام رسولوں کو جھٹلا دینا تھا۔ علاوہ بریں اِن قوموں میں سے ہر ایک نے محض اپنے ہاں آنے والے رسول ہی کی رسالت کا انکار نہ کیا تھا بلکہ وہ سرے سے یہی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھیں کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آ سکتا ہے، اس لیے وہ نفسِ رسالت کی منکر تھیں اور ان میں سے کسی کا جرم بھی صرف ایک رسول کی تکذیب تک محدود نہ تھا۔

[۱۷] یہ آخرت کے حق میں تاریخی استدلال ہے۔ اس سے پہلے کی ۶ آیتوں میں امکانِ آخرت

کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے ؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں[۱۱] ع ۱

کے دلائل دیئے گئے تھے ، اور اب اِن آیات میں عرب اور اس کے گرد و پیش کی قوموں کے تاریخی انجام کو اِس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ آخرت کا جو عقیدہ تمام انبیاء علیہم السلام پیش کرتے رہے ہیں وہی حقیقت کے عین مطابق ہے ، کیونکہ اس کا انکار جس قوم نے بھی کیا وہ شدید اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہو کر رہی اور آخر کار خدا کے عذاب نے اس کے وجود سے دنیا کو پاک کیا - آخرت کے انکار اور اخلاق کے فساد کا یہ لزوم ، جو تاریخ کے دوران میں مسلسل نظر آرہا ہے ، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انسان فی الواقع اس دنیا میں غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ اسے لازماً اپنی مہلتِ عمل ختم ہونے کے بعد اپنے اعمال کا حساب دینا ہے - اسی لیے تو جب کبھی وہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر دنیا میں کام کرتا ہے ، اس کی پوری زندگی تباہی کے راستے پر چل پڑتی ہے - کسی کام سے اگر پے در پے غلط نتائج برآمد ہوتے چلے جائیں تو یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ وہ کام حقیقت سے متصادم ہو رہا ہے -

[۱۱] یہ آخرت کے حق میں عقلی استدلال ہے - جو شخص خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اِس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اِس منظم کائنات اور اس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے ، اُس کے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ خدا ہی نے ہمیں اور اِس پوری کائنات کو پیدا کیا ہے - اب یہ امر واقعہ کہ ہم اِس دنیا میں زندہ موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے ، آپ ہی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اِس کائنات کو پیدا کرنے سے عاجز نہ تھا - اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دوسرا نظامِ عالم نہ بنا سکے گا ، اور موت دینے کے بعد وہ ہمیں دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا ، تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے - خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کر سکتا جب وہ پہلے پیدا کر چکا ہے اور اسی تخلیق کی بدولت ہم خود وجود میں آئے بیٹھے ہیں ، تو یہ فرض کر لینے کے لیے آخر کیا معقول بنیاد ہو سکتی ہے کہ

۱۹ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہیں۲۰، (اور ہمارے اِس براہِ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو۲۱

اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا دینے سے وہ عاجز ہو جائے گا۔

۱۹ آخرت کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم چاہے اس آخرت کو مانو یا اس کا انکار کرو، بہر حال اس کو آنا ہے اور یہ ایک ایسا امر واقعہ ہے جو تمہارے انکار کے باوجود پیش آ کر رہے گا۔ انبیاء کی پیشگی تنبیہ کو مان کر اُس وقت کے لیے پہلے سے تیاری کر لوگے تو اپنا بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود ہی اپنی شامت بلاؤ گے۔ تمہارے نہ ماننے سے آخرت آتے آتے رُک نہیں جائے گی اور خدا کا قانونِ عدل معطل نہ ہو جائے گا۔

۲۰ یعنی ہماری قدرت اور ہمارے علم نے انسان کو اندر اور باہر سے اِس طرح گھیر رکھا ہے کہ اُس کی رگِ گردن بھی اُس سے اُتنی قریب نہیں ہے جتنا ہمارا علم اور ہماری قدرت اس سے قریب ہے۔ اُس کی بات سننے کے لیے ہمیں کہیں سے چل کر نہیں آنا پڑتا، اُس کے دل میں آنے والے خیالات تک کو ہم براہِ راست جانتے ہیں۔ اسی طرح اگر اسے پکڑنا ہو گا تو ہم کہیں سے آ کر اس کو نہیں پکڑیں گے، وہ جہاں بھی ہے ہر وقت ہماری گرفت میں ہے، جب چاہیں گے اسے دھر لیں گے۔

۲۱ یعنی ایک طرف تو ہم خود براہِ راست انسان کی حرکات و سکنات اور اس کے خیالات کو جانتے ہیں، دوسری طرف ہر انسان پر دو فرشتے مامور ہیں جو اس کی ایک ایک بات کو نوٹ کر رہے ہیں اور اس کا کوئی قول و فعل ان کے ریکارڈ سے نہیں چھوٹتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی عدالت میں انسان کی پیشی ہو گی اُس وقت اللہ کو خود بھی معلوم ہو گا کہ کون کیا کر کے آیا ہے، اور اس پر شہادت دینے کے لیے دو گواہ بھی موجود ہوں گے جو اُس کے اعمال کا دستاویزی ثبوت لا کر سامنے رکھ دیں گے۔ یہ دستاویزی ثبوت کس نوعیت کا ہو گا، اس کا ٹھیک ٹھیک تصور کرنا تو ہمارے

پھر دیکھو، وہ موت کی جاں کنی حق لے کر آ پہنچی،[۲۲] یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔[۲۳] اور پھر صور پھونکا گیا،[۲۴] یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا۔ ہر شخص اس حال میں آ گیا کہ اُس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔[۲۵] اس

لیے مشکل ہے۔ مگر جو حقائق آج ہمارے سامنے آ رہے ہیں انہیں دیکھ کر یہ بات بالکل یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جس فضا میں انسان رہتا اور کام کرتا ہے اُس میں ہر طرف اُس کی آوازیں، اُس کی تصویریں اور اس کی حرکات وسکنات کے نقوش ذرّے ذرّے پر ثبت ہو رہے ہیں اور ان میں سے ہر چیز کو بعینہٖ اُنہی شکلوں اور آوازوں میں دوبارہ اِس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ اصل اور نقل میں ذرہ برابر فرق نہ ہو۔ انسان یہ کام نہایت ہی محدود پیمانے پر آلات کی مدد سے کر رہا ہے۔ لیکن خدا کے فرشتے نہ ان آلات کے محتاج ہیں نہ اِن قیود سے مقید۔ انسان کا اپنا جسم اور اس کے گرد وپیش کی ہر چیز اُن کی ٹیپ اور اُن کی فلم ہے جس پر وہ ہر آواز اور ہر تصویر کو اس کی نازک ترین تفصیلات کے ساتھ جُوں کی تُوں ثبت کر سکتے ہیں اور قیامت کے روز آدمی کو اس کے اپنے کانوں سے اُس کی اپنی آوازیں اُس کی وہ باتیں سنوا سکتے ہیں جو وہ دنیا میں کرتا تھا، اور اس کی اپنی آنکھوں سے اس کے اپنے تمام کرتوتوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا سکتے ہیں جن کی صحت سے انکار کرنا اس کے لیے ممکن نہ رہے۔

اِس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی عدالت میں کسی شخص کو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر سزا نہ دے دیگا بلکہ عدل کی تمام شرائط پوری کر کے اس کو سزا دے گا۔ اسی لیے دنیا میں ہر شخص کے اقوال وافعال کا مکمل ریکارڈ تیار کرایا جا رہا ہے تاکہ اس کی کارگزاریوں کا پورا ثبوت ناقابلِ انکار شہادتوں سے فراہم ہو جائے۔

۲۲ے حق لے کر آ پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ موت کی جاں کنی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے وہ حقیقت کھُلنی شروع ہو جاتی ہے جس پر دنیا کی زندگی میں پردہ پڑا ہوا تھا۔ اِس مقام سے آدمی وہ دوسرا عالم صاف دیکھنے لگتا ہے جس کی خبر انبیاء علیہم السّلام نے دی تھی۔ یہاں آدمی کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آخرت بالکل برحق ہے، اور یہ حقیقت بھی اس کو معلوم ہو جاتی ہے کہ زندگی کے اِس دوسرے مرحلے

چیز کی طرف سے تُو غفلت میں تھا، ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔[26] اُس کے ساتھی نے عرض کیا یہ جو میری سپردگی میں تھا حاضر ہے۔[27]

میں وہ نیک بخت کی حیثیت سے داخل ہو رہا ہے یا بدبخت کی حیثیت سے۔

[23] یعنی یہ وہی حقیقت ہے جس کو ماننے سے تُو کنّی کتراتا تھا۔ تو چاہتا تھا کہ دنیا میں بے نتھے بَیل کی طرح چھوٹا پھرے اور مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں تجھے اپنے اعمال کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ اسی لیے آخرت کے تصوّر سے تُو دُور بھاگتا تھا اور کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ کبھی یہ عالَم بھی برپا ہونا ہے۔ اب دیکھ لے، یہ وہی دوسرا عالَم تیرے سامنے آ رہا ہے۔

[24] اس سے مراد وہ نفخِ صور ہے جس کے ساتھ ہی تمام مرے ہوئے لوگ دوبارہ حیاتِ جسمانی پا کر اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۵۵۲۔ جلد دوم، ص ۴۹۳۔ جلد سوم، ص ۱۲۲-۱۹۹-۶۰۶۔ جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۴۷۔

[25] اغلب یہ ہے کہ اس سے مراد وہی دو فرشتے ہیں جو دنیا میں اُس شخص کے قول و عمل کا ریکارڈ مرتب کرنے کے لیے مامور رہے تھے۔ قیامت کے روز جب صور کی آواز بلند ہوتے ہی ہر انسان اپنے مرقد سے اٹھے گا تو فوراً وہ دونوں فرشتے آ کر اسے اپنے چارج میں لے لیں گے۔ ایک اسے عدالت گاہِ خداوندی کی طرف ہانکتا ہوا لے چلے گا اور دوسرا اس کا نامۂ اعمال ساتھ لیے ہوئے ہو گا۔

[26] یعنی اب تو تجھے خوب نظر آ رہا ہے کہ وہ سب کچھ یہاں موجود ہے جس کی خبر خدا کے نبی تجھے دیتے تھے۔

[27] بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ساتھی" سے مراد وہ فرشتہ ہے جسے آیت نمبر ۲۱ میں "گواہی دینے والا" فرمایا گیا ہے، وہ کہے گا کہ یہ اس شخص کا نامۂ اعمال میرے پاس تیار ہے۔ کچھ دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ "ساتھی" سے مراد وہ شیطان ہے جو دنیا میں اُس شخص کے ساتھ لگا ہوا تھا، وہ عرض کرے گا کہ یہ شخص جس کو میں نے اپنے قابو میں کر کے جہنم کے لیے تیار کیا تھا اب آپ کی خدمت

حکم دیا گیا "پھینک دو جہنم میں[۲۸] ہر کٹّے کافر[۲۹] کو جو حق سے عناد رکھتا تھا، خیر کو روکنے والا[۳۰] اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا[۳۱]، شک میں پڑا ہوا تھا[۳۲] اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا۔ ڈال دو اسے سخت عذاب میں[۳۳]۔" اس کے ساتھی نے عرض کیا "خداوندا،

میں حاضر ہے۔ مگر سیاق و سباق سے زیادہ مناسبت رکھنے والی تفسیر وہ ہے جو قتادہ اور ابن زید سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ساتھی سے مراد ہانک کر لانے والا فرشتہ ہے اور وہی عدالتِ الٰہی میں پہنچ کر عرض کرے گا کہ یہ شخص جو میری سپردگی میں تھا سرکار کی پیشی میں حاضر ہے۔

۲۸ اصل الفاظ ہیں اَلْقِیَا فِیْ جَھَنَّمَ "پھینک دو جہنم میں تم دونوں" سلسلۂ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ حکم اُن دونوں فرشتوں کو دیا جائے گا جنہوں نے مرقد سے اٹھتے ہی مجرم کو گرفتار کیا تھا اور لاکر عدالت میں حاضر کر دیا تھا۔

۲۹ اصل میں لفظ "کَفَّارٌ" استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ایک، سخت ناشکرا۔ دوسرے سخت منکرِ حق۔

۳۰ خیر کا لفظ عربی زبان میں مال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بھلائی کے لیے بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مال میں سے کسی کا حق ادا نہ کرتا تھا، نہ خدا کا نہ بندوں کا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ بھلائی کے راستے سے خود ہی رک جانے پر اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکتا تھا۔ دنیا میں خیر کے لیے سدِّ راہ بنا ہوا تھا۔ اپنی ساری قوتیں اس کام میں صرف کر رہا تھا کہ نیکی کسی طرح پھیلنے نہ پائے۔

۳۱ یعنی اپنے ہر کام میں اخلاق کی حدیں توڑ دینے والا تھا۔ اپنے مفاد اور اپنی اغراض اور خواہشات کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار تھا۔ حرام طریقوں سے مال سمیٹتا اور حرام راستوں میں صرف کرتا تھا۔ لوگوں کے حقوق پر دست درازیاں کرتا تھا۔ نہ اس کی زبان کسی حد کی پابند تھی نہ اس کے ہاتھ کسی ظلم اور زیادتی سے رکتے تھے۔ بھلائی کے راستے میں صرف رکاوٹیں ڈالنے ہی پر بس نہ کرتا تھا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بھلائی اختیار کرنے والوں کو ستاتا تھا اور بھلائی کے لیے کام کرنے والوں

میں نے اِس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہُوا تھا" جواب ستم ڈھاتا تھا۔

۳۲؎ اصل میں لفظ "مُرِیْبٌ" استعمال ہُوا ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ایک، شک کرنے والا۔ دوسرے، شک میں ڈالنے والا۔ اور دونوں ہی معنی یہاں مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خود شک میں پڑا ہوا تھا اور دوسروں کے دلوں میں شکوک ڈالتا تھا۔ اس کے نزدیک اللہ اور آخرت اور ملائکہ اور رسالت اور وحی، غرض دین کی سب صداقتیں مشکوک تھیں۔ حق کی جو بات بھی انبیاء کی طرف سے پیش کی جاتی تھی، اُس کے خیال میں وہ قابلِ یقین نہ تھی۔ اور یہی بیماری وہ اللہ کے دوسرے بندوں کو لگاتا پھرتا تھا۔ جس شخص سے بھی اس کو سابقہ پیش آتا اُس کے دل میں وہ کوئی نہ کوئی شک اور کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتا۔

۳۳؎ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ صفات گِن کر بتا دی ہیں جو انسان کو جہنم کا مستحق بنانے والی ہیں: (۱) انکارِ حق، (۲) خدا کی ناشکری، (۳) حق اور اہلِ حق سے عناد، (۴) بھلائی کے راستے میں سدِّ راہ بننا، (۵) اپنے مال سے خدا اور بندوں کے حقوق ادا نہ کرنا، (۶) اپنے معاملات میں حدود سے تجاوز کرنا، (۷) لوگوں پر ظلم اور زیادتیاں کرنا، (۸) دین کی صداقتوں پر شک کرنا، (۹) دوسروں کے دلوں میں شکوک ڈالنا، اور (۱۰) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدائی میں شریک ٹھیرانا۔

۳۴؎ یہاں محولِ کلام خود بتا رہا ہے کہ "ساتھی" سے مراد وہ شیطان ہے جو دنیا میں اُس شخص کے ساتھ لگا ہُوا تھا۔ اور یہ بات بھی اندازِ بیان ہی سے مترشح ہوتی ہے کہ وہ شخص اور اُس کا شیطان، دونوں خدا کی عدالت میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ حضور، یہ ظالم میرے پیچھے پڑا ہُوا تھا اور اِسی نے آخرکار مجھے گمراہ کر کے چھوڑا، اِس لیے سزا اس کو ملنی چاہیے اور شیطان جواب میں کہتا ہے کہ سرکار، میرا اِس پر کوئی زور تو نہیں تھا کہ یہ سرکش نہ بننا چاہتا ہو اور مَیں نے زبردستی اس کو سرکش بنا دیا ہو۔ یہ کم بخت تو خود نیکی سے نفور اور بدی پر فریفتہ تھا۔ اِسی لیے انبیاء کی کوئی بات اِسے پسند نہ آئی اور میری ترغیبات پر یہ پھسلتا چلا گیا۔

میں ارشاد ہوا "میرے حضور جھگڑا نہ کرو، میں تم کو پہلے ہی انجامِ بد سے خبردار کر چکا تھا[۳۵]
میرے ہاں بات پلٹی نہیں جاتی[۳۶] اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں[۳۷]" ع ۲
وہ دن جبکہ ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے؟[۳۸]

---

۳۵ یعنی تم دونوں ہی کو میں نے متنبہ کر دیا تھا کہ تم میں سے جو بہکائے گا وہ کیا سزا پائے گا اور جو بہکے گا اُسے کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میری اس تنبیہ کے باوجود جب تم دونوں اپنے اپنے حصے کا جُرم کرنے سے باز نہ آئے تو اب جھگڑا کرنے سے حاصل کیا ہے۔ بہکنے والے کو بہکنے کی اور بہکانے والے کو بہکانے کی سزا تو اب لازماً ملنی ہی ہے۔

۳۶ یعنی فیصلے بدلنے کا دستور میرے ہاں نہیں ہے۔ تم کو جہنم میں پھینک دینے کا جو حکم میں دے چکا ہوں وہ اب واپس نہیں لیا جا سکتا۔ اور نہ اُس قانون ہی کو بدلا جا سکتا ہے جس کا اعلان میں نے دنیا میں کر دیا تھا کہ گمراہ کرنے اور گمراہ ہونے کی کیا سزا آخرت میں دی جائیگی۔

۳۷ اصل میں لفظ "ظَلّام" استعمال ہوا ہے جس کے معنی بہت بڑے ظالم کے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنے بندوں کے حق میں ظالم تو ہوں مگر بہت بڑا ظالم نہیں ہوں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں خالق اور رب ہو کر اپنی ہی پروردہ مخلوق پر ظلم کروں تو بہت بڑا ظالم ہونگا۔ اس لیے میں سرے سے کوئی ظلم بھی اپنے بندوں پر نہیں کرتا۔ یہ سزا جو میں تم کو دے رہا ہوں یہ ٹھیک ٹھیک وہی سزا ہے جس کا مستحق تم نے اپنے آپ کو خود بنایا ہے۔ تمہارے استحقاق سے رتی بھر بھی زیادہ سزا تمہیں نہیں دی جا رہی ہے۔ میری عدالت بے لاگ انصاف کی عدالت ہے۔ یہاں کوئی شخص کوئی ایسی سزا نہیں پا سکتا جس کا وہ فی الحقیقت مستحق نہ ہو۔ اور جس کے لیے اس کا استحقاق بالکل یقینی شہادتوں سے ثابت نہ کر دیا گیا ہو۔

۳۸ اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ "میرے اندر اب مزید آدمیوں کی گنجائش نہیں ہے"۔ دوسرے یہ کہ "اور جتنے مجرم بھی ہیں انہیں لے آئیے"۔ پہلا مطلب لیا جائے تو اس ارشاد سے تصوّر یہ سامنے آتا ہے کہ مجرموں کو جہنم میں اس طرح ٹھونس ٹھونس کر بھر دیا گیا ہے

اور جنّت متقین کے قریب لے آئی جائے گی، کچھ بھی دور نہ ہوگی۔[۳۹] ارشاد ہوگا "یہ ہے

کہ اس میں ایک سوئی کی بھی گنجائش نہیں رہی، حتیٰ کہ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تو بھر گئی تو وہ گھبرا کر چیخ اٹھی کہ کیا ابھی اور آدمی بھی آنے باقی ہیں؟ دوسرا مطلب لیا جائے تو یہ تصوّر ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ جہنم کا غیض اس وقت مجرموں پر کچھ اس بری طرح بھڑکا ہوا ہے کہ وہ ہل من مزید کا مطالبہ کیے جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ آج کوئی مجرم اس سے چھوٹنے نہ پائے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہنم سے اللہ تعالیٰ کے اس خطاب اور اس کے جواب کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ محض مجازی کلام ہے؟ یا فی الواقع جہنّم کوئی ذی روح اور ناطق چیز ہے جسے مخاطب کیا جا سکتا ہو اور وہ بات کا جواب دے سکتی ہو؟ اس معاملہ میں درحقیقت کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مجازی کلام ہو اور محض صورتِ حال کا نقشہ کھینچنے کے لیے جہنّم کی کیفیت کو سوال و جواب کی شکل میں بیان کیا گیا ہو، جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ میں نے موٹر سے پوچھا تو چلتی کیوں نہیں، اُس نے جواب دیا: میرے اندر پٹرول نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی بالکل ممکن ہے کہ یہ کلام مبنی برحقیقت ہو۔ اس لیے کہ دنیا کی جو چیزیں ہمارے لیے جامد و صامت ہیں اُن کے متعلق ہمارا یہ گمان کرنا درست نہیں ہو سکتا کہ وہ ضرور اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ویسی ہی جامد و صامت ہوں گی۔ خالق اپنی ہر مخلوق سے کلام کر سکتا ہے اور اس کی ہر مخلوق اُس کے کلام کا جواب دے سکتی ہے خواہ ہمارے لیے اس کی زبان کتنی ہی ناقابلِ فہم ہو۔

۳۹؎ یعنی جونہی کہ کسی شخص کے متعلق اللہ تعالیٰ کی عدالت سے یہ فیصلہ ہوگا کہ وہ متقی اور جنت کا مستحق ہے، فی الفور وہ جنّت کو اپنے سامنے موجود پائے گا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے اُسے کوئی مسافت طے نہیں کرنی پڑے گی کہ پاؤں سے چل کر یا کسی سواری میں بیٹھ کر سفر کرتا ہوا وہاں جائے اور فیصلے کے وقت اور دخولِ جنّت کے درمیان کوئی وقفہ ہو۔ بلکہ اِدھر فیصلہ ہوا اور اُدھر متقی جنت میں داخل ہو گیا۔ گویا وہ جنت میں پہنچایا نہیں گیا ہے بلکہ خود جنّت ہی اٹھا کر اس کے پاس لے آئی گئی ہے۔ اس سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالمِ آخرت میں زمان و مکان کے تصوّرات ہماری اس دنیا کے تصورات

وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اُس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا[۳۰] اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا[۳۱]، جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا[۳۲]، اور جو دلِ گرویدہ لیے ہوتے

سے کس قدر مختلف ہوں گے۔ جلدی اور دیر اور دُوری اور نزدیکی کے وہ سارے مفہومات وہاں بے معنی ہو جائیں گے جن سے ہم اس دنیا میں واقف ہیں۔

۳۰؎ اصل میں لفظ اَوّاب استعمال ہُوا ہے جس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جس نے نافرمانی اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کا راستہ چھوڑ کر طاعت اور اللہ کی رضا جوئی کا راستہ اختیار کر لیا ہو، جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہے، اور اُس چیز کو اختیار کر لے جو اللہ کو پسند ہے، جو راہِ بندگی سے ذرا قدم ہٹتے ہی گھبرا اٹھے اور توبہ کر کے بندگی کی راہ پر پلٹ آئے، جو کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والا اور اپنے تمام معاملات میں اس کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔

۳۱؎ اصل میں لفظ "حفیظ" استعمال ہُوا ہے جس کے معنی ہیں "حفاظت کرنے والا"، اور اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اللہ کے حدود اور اس کے فرائض اور اس کی حُرمتوں اور اس کی سپرد کی ہوئی امانتوں کی حفاظت کرے، جو اُن حقوق کی نگہداشت کرے جو اللہ کی طرف سے اُس پر عائد ہوتے ہیں، جو اُس عہد و پیمان کی نگہداشت کرے جو ایمان لا کر اُس نے اپنے رب سے کیا ہے، جو اپنے اوقات اور اپنی قوتوں اور محنتوں اور کوششوں کی پاسبانی کرے کہ ان میں سے کوئی چیز غلط کاموں میں ضائع نہ ہو، جو توبہ کر کے اس کی حفاظت کرے اور اسے پھر نہ ٹوٹنے دے۔

۳۲؎ یعنی باوجود اس کے کہ رحمان اُس کو کہیں نظر نہ آتا تھا، اور اپنے حواس سے کسی طرح بھی وہ اس کو محسوس نہ کر سکتا تھا، پھر بھی وہ اس کی نافرمانی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس کے دل پر دوسری محسوس طاقتوں اور علانیہ نظر آنے والی زور آور ہستیوں کے خوف کی بہ نسبت اُس اَن دیکھے رحمان کا خوف زیادہ غالب تھا۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ رحمٰن ہے، اس کی رحمت کے بھروسے پر وہ گناہ گار نہیں بنا بلکہ ہمیشہ اس کی ناراضی سے ڈرتا ہی رہا۔ اس طرح یہ آیت مومن کی دو اہم اور بنیادی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ محسوس نہ ہونے اور نظر نہ آنے کے باوجود خدا سے ڈرتا

آیا ہے[۴۳]۔ داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ[۴۴]" وہ دن حیاتِ ابدی کا دن ہوگا۔

ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خدا کی صفتِ رحمت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود گناہوں پر جری نہیں ہوتا۔ یہی دو خوبیاں اسے اللہ کے ہاں قدر کا مستحق بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس آیت میں ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے امام رازی نے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ عربی زبان میں ڈر کے لیے خوف اور خشیت دو لفظ استعمال ہوتے ہیں جن کے مفہوم میں ایک باریک فرق ہے۔ خوف کا لفظ بالعموم اُس ڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کی طاقت کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کے احساس کی بنا پر آدمی کے دل میں پیدا ہو۔ اور خشیت اُس ہیبت کے لیے بولتے ہیں جو کسی کی عظمت کے تصور سے آدمی کے دل پر طاری ہو۔ یہاں خوف کے بجائے خشیت کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مومن کے دل میں اللہ کا ڈر محض اس کی سزا کے خوف ہی سے نہیں ہوتا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اللہ کی عظمت و بزرگی کا احساس اُس پر ہر وقت ایک ہیبت طاری کیے رکھتا ہے۔

۴۳ے اصل الفاظ ہیں "قلبِ مُنیب" لے کر آیا ہے۔ مُنیب انابت سے ہے جس کے معنی ایک طرف رُخ کرنے اور بار بار اُسی کی طرف پلٹنے کے ہیں۔ جیسے قطب نما کی سوئی ہمیشہ قطب ہی کی طرف رُخ کیے رہتی ہے اور آپ خواہ کتنا ہی ہلائیں جُلائیں، وہ پھر پھرا کر پھر قطب ہی کی سمت میں آجاتی ہے۔ پس قلبِ مُنیب سے مراد ایسا دل ہے جو ہر طرف سے رُخ پھیر کر ایک اللہ کی طرف مُڑ گیا اور پھر زندگی بھر جو احوال بھی اُس پر گزرے ان میں وہ بار بار اسی کی طرف پلٹتا رہا۔ اِسی مفہوم کو ہم نے دلِ گرویدہ کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں اصلی قدر اُس شخص کی ہے جو محض زبان سے نہیں بلکہ پُورے خلوص کے ساتھ سچے دل سے اُسی کا ہو کر رہ جائے۔

۴۴ے اصل الفاظ ہیں اُدْخُلُوْھَا بِسَلَامٍ۔ سلام کو اگر سلامتی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے رنج اور غم اور فکر اور آفات سے محفوظ ہو کر اس جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور اگر اسے سلام ہی کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ آؤ اس جنت میں اللہ اور اس کے ملائکہ کی طرف سے تم کو سلام ہے۔

وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے۔[۴۵]

ہم ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے بہت زیادہ طاقتور تھیں اور دنیا کے ملکوں کو انہوں نے چھان مارا تھا۔[۴۶] پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے؟[۴۷] اس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے ہر اُس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو، یا جو توجہ سے بات کو سُنے۔[۴۸]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ صفات بتادی ہیں جن کی بنا پر کوئی شخص جنت کا مستحق ہوتا ہے، اور وہ ہیں (۱) تقویٰ، (۲) رجوع الی اللہ، (۳) اللہ سے اپنے تعلق کی نگہداشت۔ (۴) اللہ کو دیکھے بغیر اور اس کی رحیمی پر یقین رکھنے کے باوجود اس سے ڈرنا، اور (۵) قلبِ مُنیب لیے ہوئے اللہ کے ہاں پہنچنا، یعنی مرتے دم تک انابت کی روش پر قائم رہنا۔

۴۵؎ یعنی جو کچھ وہ چاہیں گے وہ تو ان کو ملے گا ہی، مگر اس پر مزید ہم اُنہیں وہ کچھ بھی دیں گے جس کا کوئی تصور تک ان کے ذہن میں نہیں آیا ہے کہ وہ اس کے حاصل کرنے کی خواہش کریں۔

۴۶؎ یعنی صرف اپنے ملک ہی میں وہ زور آور نہ تھیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی وہ جا گھسی تھیں اور ان کی تاخت کا سلسلہ روئے زمین پر دُور دُور تک پہنچا ہوا تھا۔

۴۷؎ یعنی جب خدا کی طرف سے ان کی پکڑ کا وقت آیا تو کیا ان کی وہ طاقت اُن کو بچا سکی؟ اور کیا دنیا میں پھر کہیں ان کو پناہ مل سکی؟ اب آخر تم کس بھروسے پر یہ امید رکھتے ہو کہ خدا کے مقابلے میں بغاوت کر کے تمہیں کہیں پناہ مل جائے گی؟

۴۸؎ بالفاظِ دیگر جو یا تو خود اپنی گرہ کی اتنی عقل رکھتا ہو کہ صحیح بات سوچے، یا نہیں تو غفلت اور تعصب سے اتنا پاک ہو کہ جب دوسرا کوئی شخص اسے حقیقت سمجھائے تو وہ کھلے کانوں سے اس کی بات سنے۔ یہ نہ ہو کہ سمجھانے والے کی آواز کان کے پردے پر سے گزر رہی ہے اور سننے والے کا دماغ کسی اور طرف مشغول ہے۔

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا۴۹ اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی۔ پس اے نبی، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو۵۰ اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے۔ اور رات کے وقت پھر اُس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔۵۱

۴۹۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ حٰم السجدہ، حواشی نمبر ۱۱ تا ۱۵

۵۰۔ یعنی امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ پوری کائنات ہم نے چھ دن میں بنا ڈالی ہے اور اس کو بنا کر ہم تھک نہیں گئے ہیں کہ اُس کی تعمیرِ نو کرنا ہمارے بس میں نہ رہا ہو۔ اب اگر یہ نادان لوگ تم سے زندگی بعد موت کی خبر سُن کر تمہارا مذاق اڑاتے ہیں اور تمہیں دیوانہ قرار دیتے ہیں تو اس پر صبر کرو۔ ٹھنڈے دل سے اِن کی ہر بیہودہ بات کو سنو اور جس حقیقت کے بیان کرنے پر تم مامور کیے گئے ہو اسے بیان کرتے چلے جاؤ۔

اِس آیت میں ضمناً ایک لطیف طنز یہود و نصاریٰ پر بھی ہے جن کی بائیبل میں یہ افسانہ گھڑا گیا ہے کہ خدا نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو بنایا اور ساتویں دن آرام کیا (پیدائش ۲ : ۲)۔ اگرچہ اب مسیحی پادری اس بات سے شرمانے لگے ہیں اور انہوں نے کتابِ مقدس کے اردو ترجمے میں "آرام کیا" کو "فارغ ہوا" سے بدل دیا ہے، مگر کنگ جیمز کی مستند انگریزی بائیبل میں AND HE RESTED ON THE SEVENTH DAY کے الفاظ صاف موجود ہیں۔ اور یہی الفاظ اُس ترجمے میں بھی پائے جاتے ہیں جو ۱۹۵۴ء میں یہودیوں نے فلیڈلفیا سے شائع کیا ہے۔ عربی ترجمہ میں بھی فاستراح فی الیوم السابع کے الفاظ ہیں۔

۵۱۔ یہ ہے وہ ذریعہ جس سے آدمی کو یہ طاقت حاصل ہوتی ہے کہ دعوتِ حق کی راہ میں اُسے خواہ کیسے ہی دل شکن اور رُوح فرسا حالات سے سابقہ پیش آئے، اور اس کی کوششوں کا خواہ کوئی ثمرہ بھی حاصل ہوتا نظر نہ آئے، پھر بھی وہ پورے عزم کے ساتھ زندگی بھر کلمۂ حق بلند کرنے اور دنیا کو خیر کی طرف بلانے کی سعی جاری رکھے۔ رب کی حمد اور اس کی تسبیح سے مراد یہاں نماز ہے،

اور جس مقام پر بھی قرآن میں حمد و تسبیح کو خاص اوقات کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد نماز ہی ہوتی ہے "طلوعِ آفتاب سے پہلے" فجر کی نماز ہے "غروب آفتاب سے پہلے" دو نمازیں ہیں ایک ظہر، دوسری عصر "رات کے وقت" مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں اور تیسری تہجد بھی رات کی تسبیح میں شامل ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد دوم، ص ۶۴۲ تا ۶۴۷۔ جلد سوم ص ۱۲۸۔ ۱۴۰ تا ۱۴۲)۔ رہی وہ تسبیح جو "سجود سے فارغ ہونے کے بعد" کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، تو اس سے مراد ذکر بعد الصلوٰۃ بھی ہو سکتا ہے اور فرض کے بعد نفل ادا کرنا بھی۔ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت حسن بن علی، حضرات ابوہریرہ، ابن عباس شَعْبِی، مجاہد، عِکرِمہ حسن بصری، قَتَادَہ، ابراہیم نَخعی اور اَوزاعِی اس سے مراد نماز مغرب کے بعد کی دو رکعتیں لیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص اور ایک روایت کے بموجب حضرت عبداللہ بن عباس کا بھی یہ خیال ہے کہ اس سے مراد ذکر بعد الصلوٰۃ ہے۔ اور ابن زید کہتے ہیں کہ اس ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد بھی نوافل ادا کیے جائیں۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ غریب مہاجرین نے حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ مالدار لوگ تو بڑے درجے لوٹ لے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا "کیا ہوا؟"۔ انہوں نے عرض کیا وہ بھی نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں، مگر وہ صدقہ کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جسے اگر تم کرو تو تم دوسرے لوگوں سے بازی لے جاؤ گے بجز اُن کے جو وہی عمل کریں جو تم کرو گے؟ وہ عمل یہ ہے کہ تم ہر نماز کے بعد ۳۳۔۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ، اور اللہ اکبر کہا کرو۔" کچھ مدت کے بعد اُن لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے مال دار بھائیوں نے بھی یہ بات سن لی ہے اور وہ بھی یہی عمل کرنے لگے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ ایک روایت میں ان کلمات کی تعداد ۳۳۔۳۳ کے بجائے دس دس بھی منقول ہوئی ہے۔

حضرت زید بن ثابت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ہدایت فرمائی تھی کہ ہم ہر نماز کے بعد ۳۳۔۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور الحمد للہ کہا کریں اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہیں۔

اور سنو، جس دن منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا، ۵۲

بعد میں ایک انصاری نے عرض کیا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کوئی کہتا ہے اگر تم ۲۵-۲۵ مرتبہ یہ تین کلمے کہو اور پھر ۲۵ مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہو تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا اسی طرح کیا کرو۔ (احمد۔ نسائی۔ دارمی)

حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر جب پلٹتے تھے تو میں نے آپ کو یہ الفاظ کہتے سنا ہے سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ۔ (احکام القرآن للجصاص)

اس کے علاوہ بھی ذکر بعد الصلوٰۃ کی متعدد صورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہیں۔ جو حضرات قرآن مجید کی اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیں وہ مشکوٰۃ، باب الذکر بعد الصلوٰۃ میں سے کوئی ذکر جو اُن کے دل کو سب سے زیادہ لگے، چھانٹ کر یاد کر لیں اور اس کا التزام کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے بتائے ہوئے ذکر سے بہتر اور کونسا ذکر ہو سکتا ہے۔ مگر یہ خیال رکھیں کہ ذکر سے اصل مقصود چند مخصوص الفاظ کو زبان سے گزار دینا نہیں ہے بلکہ اُن معانی کو ذہن میں تازہ اور مستحکم کرنا ہے جو ان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے جو ذکر بھی کیا جائے اس کے معنی اچھی طرح سمجھ لینے چاہییں اور پھر معنی کے استحضار کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے

۵۲ یعنی جو شخص جہاں مرا پڑا ہو گا، یا جہاں بھی دنیا میں اس کی موت واقع ہوئی تھی، وہیں خدا کے منادی کی آواز اُس کو پہنچے گی کہ اٹھو اور چلو اپنے رب کی طرف اپنا حساب دینے کے لیے۔ یہ آواز کچھ اس طرح کی ہو گی کہ روئے زمین کے چپے چپے پر جو شخص بھی زندہ ہو کر اٹھے گا وہ محسوس کریگا کہ پکارنے والے نے کہیں قریب ہی سے اس کو پکارا ہے۔ ایک ہی وقت میں پورے کرۂ ارض پر ہر جگہ یہ آواز یکساں سنائی دے گی۔ اس سے بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ عالم آخرت میں زمان و مکان کے اعتبارات ہماری موجودہ دنیا کی بہ نسبت کس قدر بدلے ہوئے ہونگے اور کیسی قوتیں کس طرح کے قوانین کے مطابق وہاں کارفرما ہونگی۔

جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سُن رہے ہونگے[۵۳] - وہ زمین سے مُردوں کے نکلنے کا دن ہوگا۔ ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں، اور ہماری طرف ہی اُس دن سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہونگے۔ یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے[۵۴]۔

۵۳ اصل الفاظ ہیں يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ سب لوگ امرِ حق کی پکار کو سُن رہے ہونگے۔ دوسرے یہ کہ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سن رہے ہونگے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ لوگ اُسی امرِ حق کی پکار کو اپنے کانوں سے سُن رہے ہونگے جس کو دنیا میں وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے، جس سے انکار کرنے پر انہیں اصرار تھا، اور جس کی خبر دینے والے پیغمبروں کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ وہ یقینی طور پر یہ آوازۂ حشر سنیں گے، انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی وہم نہیں ہے بلکہ واقعی یہ آوازِ حشر ہی ہے، کوئی شبہ انہیں اس امر میں نہ رہے گا کہ جس حشر کی انہیں خبر دی گئی تھی وہ آگیا ہے اور یہ اُسی کی پکار بلند ہو رہی ہے۔

۵۴ یہ جواب ہے کُفّار کی اُس بات کا جو آیت نمبر ۳ میں نقل کی گئی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر کر خاک ہو چکے ہوں اُس وقت ہمیں پھر سے زندہ کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے، یہ واپسی تو بعید از عقل و امکان ہے۔ اُن کی اِسی بات کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ یہ حشر، یعنی سب اگلے پچھلے انسانوں کو بیک وقت زندہ کر کے جمع کر لینا ہمارے لیے بالکل آسان ہے۔ ہمارے لیے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ کس شخص کی خاک کہاں پڑی ہے۔ ہمیں یہ جاننے میں بھی کوئی دقّت نہیں پیش آئے گی کہ ان بکھرے ہوئے ذرات میں سے زید کے ذرات کون سے ہیں اور بکر کے ذرات کون سے۔ ان سب کو الگ الگ سمیٹ کر ایک ایک آدمی کا جسم پھر سے بنا دینا، اور اُس جسم میں اُسی شخصیت کو از سرِ نو پیدا کر دینا جو پہلے اس میں رہ چکی تھی، ہمارے لیے کوئی بڑا محنت طلب کام نہیں ہے، بلکہ ہمارے ایک اشارے سے یہ سب کچھ

اے نبی، جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں[۵۵]، اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ بس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے[۵۶]۔ ع

آنا فاناً ہو سکتا ہے۔ وہ تمام انسان جو آدم کے وقت سے قیامت تک دنیا میں پیدا ہوئے ہیں ہمارے ایک حکم پر بڑی آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں۔ تمہارا چھوٹا سا دماغ اسے بعید سمجھتا ہو تو سمجھا کرے۔ خالقِ کائنات کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے۔

۵۵۔ اِس فقرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور کفار کے لیے دھمکی بھی۔ حضور کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تم پر جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں اُن کی قطعاً پروا نہ کرو، ہم سب کچھ سُن رہے ہیں اور ان سے نمٹنا ہمارا کام ہے۔ کفار کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ ہمارے نبی پر جو فقرے تم کس رہے ہو وہ تمہیں بہت مہنگے پڑیں گے۔ ہم خود ایک ایک بات سن رہے ہیں اور اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔

۵۶۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جبراً لوگوں سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے روک دیا۔ بلکہ دراصل یہ بات حضور کو مخاطب کر کے کفار کو سنائی جا رہی ہے۔ گویا ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ہمارا نبی تم پر جبّار بنا کر تو نہیں بھیجا گیا ہے۔ اُس کا کام زبردستی تمہیں مومن بنانا نہیں ہے کہ تم نہ ماننا چاہو اور وہ جبراً تم سے منوائے۔ اس کی ذمہ داری تو بس اتنی ہے کہ جو متنبہ کرنے سے ہوش میں آجائے اُسے قرآن سُنا کر حقیقت سمجھا دے۔ اب اگر تم نہیں مانتے تو نبی تم سے نہیں نمٹے گا بلکہ ہم تم سے نمٹیں گے۔